میں متعارف کروایا۔

ڈرامہ لکھنے کے بارے میں اشفاق صاحب بتایا کرتے تھے کہ میں جب مکالمے لکھتا ہوں تو پہلے میں خود بولتا ہوں تا کہ اندازہ کر سکوں کہ کہیں بولنے والے کو وہ مکالمے ادا کرنے میں کوئی دشواری تو محسوس نہیں ہوگی۔ جب وہ کسی فنکار کو کوئی کردار ادا کرنے کے لیے کہتے تو فنکار کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے کردار لکھتے تا کہ اُس کردار کرنے والے کو مشکل نہ پڑے۔

اشفاق صاحب کے ڈراموں میں مضبوط پلاٹ کے ساتھ ساتھ کردار بھی بڑے جاندار ہوتے تھے۔ میں انسانی نفسیات سے آگاہی، گہرا مشاہدہ اور مختلف طبقوں سے میل جول ان کا مددگار ثابت ہوتا تھا۔ ٹیلی ویژن تقریباً چالیس سال تک اشفاق صاحب کے زیرِ اثر رہا۔ نئے لکھنے والوں نے بھی اشفاق صاحب کے دیے ہوئے کو ہی اپنایا۔ لوگ آج بھی پوچھتے ہیں کہ اب ویسے ڈرامے کیوں نہیں ہوتے کیونکہ آج کے ٹی وی ڈرامے معیار کے اعتبار سے گراوٹ کا شکار ہیں۔

ٹی وی کے ابتدائی دور میں اشفاق صاحب ڈرامہ لکھتے تو کرداروں کے سامنے ان فنکاروں کے نام لکھتے جن فنکاروں کو وہ ان کرداروں کے لیے منتخب کرتے۔ پروڈیوسر بھی اشفاق صاحب کی خواہش کے مطابق انہیں منتخب کرتا۔ جب فنکاروں کو یہ علم ہوا کہ کاسٹنگ تو اشفاق صاحب ہی کرتے ہیں تو انہوں نے مرکزی اردو بورڈ لگانے شروع کر دیئے جہاں اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل تھے۔

ہمارے ملک میں فنکار تو ہوتا ہی غریب ہے اور پھر اس دور میں تو فنکار تھے بھی بہت زبوں حالی کا شکار اپنی ضرورتیں اور مجبوریاں۔ ہر ایک چاہتا کہ اسے آنے والے Episode میں ضرور کام دیا جائے۔ خود فنکاروں کو صرف ایک ڈرامے میں تو نہیں سمویا جا سکتا تھا۔ جب کوئی ایسا فنکار جسے کام نہ ملا ہوتا اشفاق صاحب اشفاق صاحب کہتے کہ یار اس بار تو تم رہ گئے، اگلی بار تمہاری باری ضرور آئے گی۔ جب وہ فنکار وعدہ لے کر رخصت ہوتا تو اشفاق صاحب فون پر اپنے پی اے شریف صاحب سے کہتے۔ ''شریف الدین! یہ صاحب ہمارے پاس سے گزر رہے ہیں انہیں روکو اور ایک لفافہ دے دو۔''

ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں فنکار کو پینتالیس روپے کا چیک ملا کرتا تھا۔ شریف الدین صاحب کے میں اس قدر رقم ہوتی کیونکہ اشفاق احمد فنکاروں کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے آگاہ تھے۔ یہ بہت بعد کی بات داستان سرائے جا چکے تھے۔ اس دور میں اشفاق صاحب نے بہت سے باکمال سلسلہ وار کھیل لکھے جن میں ''حیرت کدہ'' ''ایک محبت سو افسانے'' ''توتا کہانی'' ''اور ڈرامے'' ''ننگے پاؤں'' ''من چلے کا سودا'' کے ساتھ شمار اور ڈرامے بھی لکھے۔ ہمارے معاشرے میں پارٹی بازی کی بہت اہمیت ہے۔ سیاست دانوں اور تاجروں سے ادیبوں تک سب گروہ بندی اور پارٹی بازی پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اشفاق احمد خاں نے کبھی کوئی گروپ بنانے یا کسی میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا سب سے بڑا گروپ یا پارٹی ان کی محنت تھی۔

اشفاق صاحب سکرپٹ لکھ کر گھر کے اخراجات پورے کرتے۔

ایک دن میں نے دیکھا اشفاق صاحب کے بیڈ روم کے ایک کونے میں ایک روسٹرم پڑا ہے۔ میں نے پوچھا صاحب یہ روسٹرم کیسے آ گیا بیڈ روم میں۔ کہنے لگے کہ آج کل لکھنے کا کام بہت زیادہ ہے۔ دن بھر تو مہمانوں کا تانتا ہے۔ رات کو جب کرسی پر بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہوں تو نیند آ جاتی ہے۔ اس لیے یہ ہی فیصلہ کیا کہ کھڑے ہو کر ہے۔ آخر گھر کے اخراجات بھی تو پورے کرنے ہیں۔

اشفاق صاحب کے کچھ مہربان یہ بھی کہتے ہیں کہ اشفاق احمد ایک بہت چالاک انسان تھا جس نے پاکستان کی فائدہ اٹھایا یا یہ کہ حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے نظریات میں بھی تبدیلی آ جاتی تھی۔ میرا خیال ہے لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ جن لوگوں نے اشفاق احمد کو قریب ہے وہ یقیناً ان باتوں سے متفق نہیں ہوں گے۔ حکومتوں کے ساتھ بدلنے والے تو کروڑوں میں کھیلتے ہیں، کر گھر کے اخراجات پورے نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ ایک بات کہا کرتے تھے کہ ''ٹھنڈا اتنا پانی ملدا رہوے تے دو روٹیاں ایس توں ودھ انسان وی ہور کی لوڑ اے۔''

دو دفعہ وقت کے حاکموں نے انہیں وزیر بننے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے دونوں مرتبہ انکار کر دیا۔ پہلی بار الحق کے دور میں اور دوسری بار نواز شریف صاحب کے دورِ حکومت میں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں تو اخبارات میں بھی شائع ہو گئیں کہ اشفاق صاحب بہت جلد اپنے عہدے کا حلف اٹھانے والے ہیں۔ میں نے بھی خبر پڑھی تو صاحب کو ٹیلی فون کر کے مبارکباد دی۔ ''خاں صاحب تسی تے وزیر بن رہے جے۔''

کہنے لگے ''توں تے دوست ایں تو کیوں بددعائیں دے رہا ہے۔''

میں نے عرض کی ''لوگ تو وزیر بننے کی تمنا کرتے ہیں۔ آپ الٹ بات کر رہے ہیں۔''

کہنے لگے ''ریاض میاں! نہ تو میں نے مال بنانا ہے اور نہ شہرت کی کوئی تمنا ہے۔ شہرت اللہ نے پہلے ہی بہت ہے اور گزارے کے لیے ہم میاں بیوی کما ہی لیتے ہیں۔ پھر میں کیوں اپنی آزادی گنواؤں۔''

میں نے کہا ''بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن وزارت، وزارت ہی ہوتی ہے۔ اُس کا اپنا چسکا ہے۔''

کہنے لگے ''میں اور تیری آپا کبھی کبھی شاہ عالمی جاتے ہیں۔ وہاں ایک بڑھیا سردیوں میں سرسوں کا ساگ پکا کر ہم وہ ساگ اس بڑھیا کے پاس پیڑھیوں پر بیٹھ کر مکئی کی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ جو چسکا اس بڑھیا کے سرسوں کے ساگ کا ہے، وہ وزارتوں یا امارتوں میں نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا ''آپ صدر صاحب کو کیسے انکار کریں گے؟''

کہنے لگے ''تیرے بچے جئیں۔ یہ ہی سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ حاکم وقت کا اصرار ہے کہ اسلام آباد چلے آؤ۔ طرف سے انکار ہے۔ دعا کرو کہ اس امتحان سے بخیر و خوبی نکل آؤں۔''

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے حکومتِ پنجاب نے انہیں علاج کے لیے پانچ لاکھ روپے دینے کی پیشکش کی لیکن جب نے شکریے کے ساتھ اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شعیب بن عزیز سے کہنے لگے۔ ''بھائی اگر نے چوہدری پرویز الٰہی کی رقم وصول کر لی تو میرے بیٹوں کو رنج ہوگا۔ ابھی علاج کی وہی کفالت کر رہے ہیں۔''

اشفاق صاحب کے افسانے، ڈرامے اور مضامین تو بہت شائع ہوئے لیکن کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے
کی شاعری کا ایک مجموعہ ''کھیاوٹیا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک دن میں اشفاق صاحب کو ملنے ان کے
اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے ''لے بھئی ریاض محمود! تینوں ایک نظم سنایئے۔''

وہ ہمیشہ مجھے پورے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے۔ میں نے پوچھا ''کس کی نظم ہے؟''

کہنے لگے ''میری۔''

میں نے عرض کیا کہ ''یہ شاعری کب سے شروع کر دی؟''

کہنے لگے ''تینوں تے پتہ ای اے کہ میں کدی شاعری نئیں کتی۔ پر پتہ نئیں کدھروں پچھلے دناں مینوں
بھوت چڑھ گیا تے میں کوئی تی چنتی نظماں لکھ چھڈیاں۔ اچھا گلاں بعد وچ کریں، پہلاں ایہہ نظم سن لے۔''

چھاونی آ لے پُل توں

پہلاں لنگیاں منڈا

فیر لنگی کڑی

فیر لنگی جیپ کار

پچھوں لنگی تیز گام

بندیاں نال بھری

ایڈھا سوہنا دن سی

میں چھٹی لے لئی۔

میں نے عرض کیا ''خاں صاحب! یہ تو کمال کی شاعری ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔''

کہنے لگے ''ریاض محمود! ایہہ ساریاں نظماں واوروولے وانگوں اک پاسیوں آئیاں تے مینوں بھوانٹیاں دے
دُوجے پاسیوں نکل گئیاں۔ مُڑ میں بڑا چارا لایا بڑی کوشش کیتی پر اک مصرعہ وی میرے نیڑے نہ ڈھکیا۔''

اشفاق صاحب کے ٹیلی ویژن ڈرامے اور ریڈیو پروگرام تلقین شاہ بھارت میں بھی اتنے شوق سے دیکھے
سنے جاتے تھے جتنے پاکستان میں۔ ایک بار بھارت کے معروف گلوکار ہنس راج ہنس پاکستان تشریف لائے۔ ایک
میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور کہا ''میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔''

ہنس راج کہنے لگے ''میں آپ کو جانتا ہوں۔''

مجھے حیرت ہوئی، پوچھا ''کیسے؟''

کہنے لگا ''میں نے تو گانا سیکھا ہی لاہور ریڈیو سٹیشن کو سن کر ہے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ لاہور ریڈیو سے
والے پروگرام ''پنجابی دربار'' میں تمہارے گانے نشر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین نہ آیا لیکن جب میں نے لاہور ریڈیو
شروع کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب سچ کہتے تھے۔''

میں نے کہا ''چلیے یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا کہ آپ مجھ سے واقف ہیں۔ اب یہ فرمایئے کہ انٹرویو کے لیے

ے؟''

راج کہنے لگے''اس بار تو مشکل ہے لیکن اگلی بار آؤں گا تو ضرور انٹرویو ریکارڈ کراؤں گا۔ ابھی پروگرام
ہے۔ پھر گلوکار شوکت علی کے ہاں کھانا ہے اور صبح پانچ بجے میری واپسی ہے۔''

نے کہا''اگلی دفعہ جب آپ آئیں تو انٹرویو ضرور ہوگا۔''

راج کہنے لگے''ایک اور خواہش تھی جو میں ساتھ لے کر آیا تھا لیکن وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔''

کیا خواہش تھی؟''میں نے پوچھا۔

کہنے لگے''لاہور میں ایک بہت بڑا بدھی جیوی رہتا ہے۔ اُن کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا''آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟''

کہنے لگے''اُن کی ساری وڈیو، آڈیو کیسٹیں میرے پاس محفوظ ہیں۔''

میں نے کہا''میں انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔''

میں راج کہنے لگے''اُن سے کہیے گا کہ ایک پاگل بھارت سے آیا تھا اور آپ کے چرن چھونے کا خواہش مند
ہونے کے باعث حاضر نہ ہو سکا لیکن آؤں گا ضرور۔''

میں راج اپنے وعدے کے مطابق اشفاق صاحب کو ملنے تو نہ آ سکا لیکن اس نے بمبئی سے اصغر ندیم سید
کے ہاتھ ایک شال اور ایک ہزار روپیہ نذرانے کے طور پر ارسال کیا۔ اشفاق صاحب کے انتقال کے بعد ایک روز
میں راج سے گفتگو ہوئی تو اس نے اشفاق صاحب کی رحلت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا''بڑا قیمتی بندا
چلا گیا۔''

''زاویہ'' پروگرام جسے اشفاق صاحب ہر ہفتے پی ٹی وی سے پیش کرتے تھے، ساری دنیا میں بسنے والے اردو
دانوں میں انتہائی مقبول تھا۔ جب اشفاق صاحب نے یہ پروگرام ابھی شروع نہیں کیا تھا تو ایک دن اس خاکسار کو
کہنے لگے

''میں ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام شروع کر رہا ہوں جس میں میں چند لوگوں کے سامنے پچیس منٹ گفتگو
کروں گا پھر اگر سامعین میں سے کوئی سوال پوچھنا چاہے تو اس کا جواب دوں گا۔''

میں نے عرض کی''حضور یہ پروگرام کامیاب نہیں ہوگا کیونکہ کون پچیس منٹ تک صرف ایک ہی آدمی کو سن سکتا
ہے۔''

کہنے لگے''تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ میر باقر علی داستان گو بھی تو ساری ساری رات ہزاروں کے مجمع سے
مخاطب ہوتا تھا اور کوئی ایک آدمی بھی پنڈال چھوڑ کے نہ جاتا تھا۔''

جب پروگرام شروع ہوا تو میرا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا اور''زاویہ'' نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔
میں یہ سمجھتا ہوں کہ اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک داستان گو تھا۔ انہوں نے جب رسالہ شروع کیا تو اس کا نام
''داستان گو'' رکھا۔ اردو میں یہ پہلا رسالہ تھا جو ریڈرز ڈائجسٹ کے سائز پر چھپتا تھا۔ اس کا مواد، سرورق اور چھپائی نہایت

اعلیٰ درجے کی تھی۔ ادبی حلقوں میں اس رسالے نے دھوم مچادی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے محنت کر کے ایک
تو نکال دیا لیکن دونوں میاں بیوی اس کے تجارتی پہلو سے ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''داستان گو'' بند ہو گیا۔

اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن میں گھر بنایا تو اس کا نام ''داستان سرائے'' رکھا۔

پروگرام ''زاویہ'' میں ان کی گفتگو کا انداز جس کے سب لوگ دیوانے تھے، داستان گو جیسا
صاحب پروگرام ''زاویہ'' کا اختتام اس جملے پر کیا کرتے تھے۔ ''اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے
تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔'' حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ بات صرف کہتے ہی نہیں تھے بلکہ اس پر عمل بھی
ہمیشہ دوسروں کے کام آتے۔ ان کی پریشانیوں میں ان کی مدد کرتے لیکن انداز ایسا اپنائے رکھتے جیسے ان کا
تعلق ہی نہ ہو یا انہوں نے کسی کے لیے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ جب کوئی خاں صاحب کے پاس اپنی کوئی پریشانی یا مشکل
آتا تو وہ اسے اس انداز سے سنتے گویا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔

اپنی پریشانی لے کر آنے والا مایوس ہو جاتا کہ لو جی میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں لیکن اشفاق
توجہ سے میری بات تک نہیں سنی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ جب کوئی پریشانی یا مشکل بیان کر چکتا تو
اس کی نہ رہتی۔ خاں صاحب کی ہو جاتی اور وہ اس پریشان شخص کی امداد کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ جب اس کا
تب بھی ایسے ظاہر کرتے کہ سب اتفاق سے ہو گیا۔ اس کام کے ہونے میں میری کسی کوشش کا دخل نہ تھا۔ کسی
بوجھ ڈالنا انہیں ناپسند تھا۔

ریڈیو کے ایک بڑے بہت فنکار کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں فنکار خواہ وہ کتنا ہی نام
مشکل سے ہی گزر بسر کرتا ہے۔ اس فنکار کی موت کے بعد اس کی بیوی بچوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ خاں
اس فنکار سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ مرحوم فنکار ریڈیو سے بحیثیت سٹاف آرٹسٹ منسلک تھے۔ آج کل تو
ملازمین کی یہ کیٹگری ہی ختم کر دی ہے لیکن اُن دنوں میں سٹاف آرٹسٹ کو ایک مقررہ تنخواہ ملتی تھی۔ کوئی میڈیکل
گریجوٹی یا پنشن اوانہ کی جاتی تھی۔

اشفاق صاحب نے کوشش کر کے اس فنکار کے گھر والوں کے لیے وظیفہ منظور کروایا۔ ہر ماہ خود بھی
امداد کرتے۔ اس فنکار کی بچیوں کی شادیوں میں بھی اشفاق صاحب اور اس خاندان کی بھرپور اعانت کی۔

ایک اور نامور ڈرامہ نگار اور صداکار جن کا بہت شہرہ تھا، انتہائی مالی پریشانیوں کا شکار تھے۔ خاں
ماہ ان کی مالی امداد فرماتے، لیکن امداد کا انداز یہ تھا کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتے۔ اتفاق سے
میری نظر اس خط پر پڑ گئی جو اُن ڈرامہ نگار صاحب نے شکریے کے طور پر اشفاق صاحب کو لکھا تھا، جس سے
حال معلوم ہوئی۔

بہت سے بچے اشفاق صاحب کے ہاں گھریلو ملازم کی حیثیت سے آئے تھے لیکن داستان سرائے
سلوک ایسا ہوتا گویا وہ اسی گھر کے بچے ہیں۔ وہ گھر کے باقی افراد کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ آپا
پڑھاتیں۔ پڑھائی کے سارے اخراجات ادا کرتیں۔ جب وہ پڑھ گئے تو اُن کو مختلف جگہوں پر ملازمتیں دلوائیں۔

بہت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

خان صاحب مہمان نواز بہت تھے۔ خود بھی خوش خوراک تھے اور دوسروں کو بھی کھلا کے خوش ہوتے تھے۔ سیخ کباب بہت پسند فرماتے تھے۔ کھانے کے معاملے میں میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ غالباً ہمارے تعلقات کی وجہ خوش خوراکی ہی تھی۔ کسی زمانے میں چونا منڈی میں خلیفہ کباب فروش کے ہاں پہنچے ہوتے اور کبھی موچی دروازہ میں کباہیئے کے ہاں اور کبھی چھاؤنی میں ماجھے کے کبابوں سے لطف اندوز ہوتے۔ بیماری کے دنوں میں ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود اشفاق صاحب کچھ کھانے پر آمادہ نہ ہوتے۔

میں نے ایک دن عرض کی "خاں صاحب! ایسے تو بہت کمزوری ہو جائے گی۔"

کہنے لگے "میرے سامنے گوشت اور شوربا رکھ دیا جاتا ہے۔ میں اسے کیا کھاؤں۔ کوئی کباب ہوں یا تکے تو کھانے پر آمادہ ہو جائے۔"

میں نے ان کی خواہش پر کئی جگہوں سے کباب لا کے انہیں کھلائے لیکن خاں صاحب کو پسند نہ آئے۔

ایک دن کہنے لگے "ریاض محمود! بڑے دکھ کی بات ہے کہ لاہور ایسا شہر ہو لیکن یہاں کوئی بھی اچھا کبابیا نہیں ...ا

جو پرانے تھے وہ یا تو کام چھوڑ گئے یا اُن کا معیار گر گیا اور جو نئے ہیں ان کا تو سرے سے کوئی معیار ہی نہیں۔

گرمیوں میں کبھی کبھی اشفاق صاحب اپنے نسخے کے مطابق سیخ کباب لگایا کرتے تھے۔ آپا قدسیہ سیخ پر قیمہ لگاتیں اور صاحب ان کو کوئلوں پر پکاتے۔ ایسے لذیذ کباب تیار ہوتے کہ جس نے بھی کھائے پھر کھانے کی تمنا کی۔

گھر میں آٹھ مہمان آ جائیں یا دس۔ اگر کھانے کا وقت ہو گیا تو وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتے تھے۔ آپا قدسیہ فوراً ہانڈی روٹی سنبھال لیتیں۔ ایسے ایسے لذیذ کھانے تیار ہوتے کہ مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

کبھی کبھی اشفاق صاحب کے ہاں مہمانوں کے درمیان کھانا پکانے کے مقابلے بھی ہوتے۔ جو سب سے لذیذ ...یع اشفاق صاحب اپنے دستخطوں والا سو روپے کا نوٹ دیتے۔ قلفے کا ساگ گوشت پکا کے ایک بار میں نے بھی

...تی۔

خاں صاحب ایک انتہائی ذہین، پڑھے لکھے، جدید نظریات پر یقین رکھنے والے اور مغربی طرزِ زندگی سے متاثر تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی علوم، تہذیب اور ثقافت سے بھی بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی لگاؤ انہیں کشمکش میں مبتلا رکھتا۔ نور والوں کے ڈیرے میں جب ان کی ملاقات ایک بابا جی سے ہوئی تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور بقول اشفاق صاحب "نور والے ڈیرے کے بابا جی سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ اصل گیان، علم اور سیدھا راستہ دکھانے کا نسخہ تو ان بابوں کے پاس ہے۔"

یہ بابے مادی ترقی کے مخالف نہیں لیکن انسانی شخصیت کو سنوارنے اور روحانی ترقی کا جو درس ان کی باتوں میں ہے وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ بابا جی کی باتوں اور اقوال کی جھلک اشفاق صاحب کی تحریروں میں بھی نظر آنے لگی اور انہی ملاقاتوں اور باتوں نے اُنہیں "من چلے کا سودا" ایسا سیریل لکھنے پر راغب کیا۔

دوسروں کی تکلیف، پریشانی یا دکھ کا حال ضرور سنتے اور موقع محل کی نسبت سے اُسے مشورہ بھی دیتے
دکھ یا پریشانی کا کسی سے ذکر نہ کرتے۔ اُن کے پتے کا آپریشن ہوا تو معلوم ہوا کہ پینکریاز پر گروتھ ہے۔ سرجن نے
احمد کے منجھلے صاحبزادے کو بتایا کہ یہ ملیگننٹ ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان صرف چند ماہ کا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔

انیس خاں نے پوچھا ''ابو کو علم ہے۔''

سرجن نے کہا ''ہم نے تو نہیں بتایا لیکن اشفاق احمد جیسے ذہین انسان سے کوئی بات چھپ نہیں سکتی
بات سے آگاہ ہیں۔''

اور اشفاق صاحب یقیناً سب کچھ جانتے تھے لیکن کبھی کسی سے ذکر تک نہ کیا کہ میں کینسر ایسے موذی
شکار ہوں۔ ہمیشہ یہی کہتے کہ یار لوگ تو پتے کا آپریشن کروا کے آٹھ دس دن میں بھلے چنگے ہو جاتے ہیں لیکن میرا
کچھ طویل ہی ہو گیا ہے۔ جب بھی کوئی پوچھتا ''آپ طبیعت کیسی ہے؟''

تو یہی کہتے ''اب پہلے سے بہتر ہوں، بس کمزوری ہے، اللہ نے چاہا تو یہ بھی جاتی رہے گی۔''

بات صرف اتنی تھی کہ اپنے پیاروں، عزیزوں یا دوستوں کو اس موذی مرض کا بتا کے پریشان نہیں کر
تھے۔ کبھی بلکہ آخری دن تک اپنے قریبی سے قریبی دوست سے بھی اپنے مرض کے متعلق کچھ نہ کہا۔

سات ستمبر کی صبح کو جب وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوئے تو رخصتی سے ذرا پہلے آپا قدسیہ کے
پریشانی کے آثار دیکھ کر کہنے لگے ''قدسیہ! گھبرانا یا پریشان مت ہونا۔ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔''

میں اور اشفاق صاحب صبح کے وقت ڈی بلاک فٹ بال گراؤنڈ ماڈل ٹاؤن میں سیر کیا کرتے تھے۔
دونوں طرف پختہ سڑکیں تھیں اور لوگ پختہ سڑکوں پر ہی سیر کیا کرتے کیونکہ گراؤنڈ ایک دو جگہوں سے قدرے
اشفاق احمد اس گراؤنڈ کو اپنی محبوب گراؤنڈ کہا کرتے تھے۔

میں نے کئی دفعہ عرض کی ''خاں صاحب! یہ گراؤنڈ ناہموار ہے۔ کیوں نہ ہم بھی سڑک پر چہل قدمی کریں
لیکن خاں صاحب نہ مانے۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ خاں صاحب کی اسی محبوب گراؤنڈ میں ان کا جنازہ ہوا
ہوئے اور وہیں چالیسواں۔ اشفاق صاحب بنیادی طور پر ایک پُرامید انسان تھے اور ہر معاملے کا روشن پہلو د
لوگ جب ملکی حالات سے پریشان ہو جاتے تو ان سے پوچھتے ''خاں صاحب! اب کیا ہوگا؟''

اکثر اُن کا جواب یہی ہوتا ''اس میں کوئی شک نہیں حالات بہت خراب ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ
میں سے بہتری کی کونپل پھوٹے گی۔ انشاء اللہ پاکستان کا شمار دنیا کے امیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں ہوگا۔ دولت تو
میں بہت آ جائے گی لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم مادیت کی دوڑ میں پڑ کے اپنی روحانی اقدار سے منہ نہ موڑ لیں۔''

ایک دن بتانے لگے ''پرویز مشرف نے مجھے ایوان صدر میں بلوایا۔''

جب گفتگو شروع ہوئی تو مشرف نے کہا ''اشفاق صاحب! ملکی حالات کی بہتری کے لیے کوئی مشورہ د

اشفاق صاحب کہنے لگے ''خلق خدا دکھی ہے لیکن کوئی اُس کا دکھ سننے والا نہیں ہے۔ لوگ نہ روٹی، نہ
کپڑا نہ مکان۔ وہ صرف ایک کندھا چاہتے ہیں جس پر سر رکھ کے وہ دو آنسو بہا سکیں۔''

کسی زمانے میں ہمارے بابے دکھوں کی بات سنتے تھے۔ انہیں حوصلہ اور مشورہ دیتے تھے لیکن اب وہ بابے بھی نہ رہے۔

ست ستمبر 2004ء کی سوگوار شام کو جب ہم ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں خاں صاحب کو سپردِ خاک کر کے لوٹے تو رہ رہ کر میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ آج آخری بابا بھی ہم سے رخصت ہو گیا۔ وہ کندھا بھی ہمارا گیا جس پر سر رکھ کے لوگ دو آنسو بہا لیا کرتے تھے۔

بیگم کولسری گو 36۔ جی کا حصہ نہ تھے لیکن وہ اردو بورڈ سے منسلک تھے۔ میں ان سے کبھی 36۔ جی میں ملتی۔ ... بن گیا تو کولسری صاحب، خاں صاحب سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی داستان بعد میں رقم کروں گی۔ ... صاحب کا مضمون دیکھیے۔

اشفاق صاحب ...ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ

اشفاق صاحب کی رحلت کے بعد تین چار مواقع پر مجھے اپنے تاثرات بیان کرنے کو کہا گیا مگر ہمت نہ پڑی کہ ... تے ہی ہونٹ ساکت ہو جاتے اور قلم گم۔ ٹیلی ویژن کے منفرد کمپیئر نورالحسن نے اسلام آباد میں اشفاق ... لیے ہونے والے ریفرنس میں شرکت کی نہ صرف دعوت دی بلکہ ہوائی جہاز کی سیٹ بھی بک کروالی۔ نورالحسن کو اشفاق صاحب کے جنازے میں آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دیکھا تھا۔ سو ان کا کہنا میرے لیے بے حد اہمیت کا ... کے بعد لاہور ٹیلی ویژن پر منعقدہ پروگرام میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ میں اپنے گوشۂ تنہائی میں چپ ... اشفاق صاحب کی یاد میں شائع ہونے والی مختلف کتب اور میگزینز میں کچھ لکھنے کو کہا گیا۔ قلم اور زبان منجمد ... بھی تک قلم چھوڑے توڑے ہوئے ہوں، آخر کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔

... چی سن کالج کے پروفیسر عرفان علی شاد کے افسانوں کی کتاب ''دھوپ کی لکیر'' شائع ہوئی تو انہوں نے ازراہ ... مجھے بھی عطا کیا۔ پہلا افسانہ ''دھوپ کی لکیر'' بے پناہ ڈرامائی کیفیات لیے ہوئے تھا، میں نے تجویز کیا کہ ... بنایا جائے، وہ کہنے لگے کہ جناب اشفاق احمد بھی یہی فرما رہے تھے، ممکن ہو تو آپ ہی کوشش کریں۔ میں نے ... کی اور پھر ہم دو ڈرامائی تشکیل لے کر اشفاق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ اشفاق صاحب سے ... ملاقات تھی جو عرفان بھائی کے توسط سے اردو سائنس بورڈ میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ انہوں نے میز کے نیچے ... اٹھا کر ہماری طرف بڑھایا جس میں بھنے ہوئے چنے تھے اور خود میرے لکھے ہوئے ''ڈرامے'' کو الٹ پلٹ کر ...

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' انہوں نے پہلا سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ ''ساہیوال کا''۔ فرمانے لگے۔ ... میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ منیر نیازی نے آ کر دھوم مچا دی۔ انہوں نے دو تین صفحے دیکھے اور پلندہ میز پر رکھ دیا۔ کچھ ... منہ سے چنے چباتے رہے۔ پھر بولے ''بھائی تم نے تو بالی وڈ کے لیے لکھ دیا۔ یار لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ یہ سین ... سڑک پر فلمایا جائے تو وہ سٹوڈیو میں بانس گاڑ لیتے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہیں ہو سکے گا۔ بہرحال تمہاری کوشش اچھی

ہے۔'' پھر انہوں نے بیل بجائی یعنی ہمارا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری کوشش مضحکہ خیز ہونے کی حد تک ناکام تھی مگر انہوں نے مجھے دل شکستہ نہیں ہونے دیا۔

کچھ مہینوں کے بعد مجھے اردو سائنس بورڈ میں ریسرچ آفیسر لسانیات کی نوکری مل گئی۔ وہ مسکرائے ''تمہارے ڈرامے کا معاوضہ مل ہی گیا۔'' میں اندر ہی اندر بہت خوش تھا کہ ان کے قریب رہ کر ڈرامہ نویسی کا فن سیکھوں گا۔ تیسرے ہی روز وہ میری میز پر آئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ''ڈرامے ورامے کا خبط نکال ذہن سے اور دفتر کے کام کی طرف پوری توجہ دو۔'' آگے بڑھ گئے۔ مجھے دھچکا سا لگا مگر کھلا کہ دفتری امور میں کسی قسم کی کاہلی یا عدم دلچسپی کو برداشت نہیں کر پاتے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ایک دن کے لیے شہر سے باہر گئے تھے۔ اگلے روز شاید کسی نے کہہ دیا کہ وہ نے سستی کو سونپ دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے طلب کیا۔ ''کل تم نے کیا کام کیا؟'' میں اس سوال پر حیران میرے چہرے پر چھپ گئی، ساتھ ہی ناخوشی کی ہلکی سی لالی بھی تیر گئی۔ میں آئیں بائیں شائیں کر کے باہر اپنی اوکاڑہ سے آئے ہوئے کچھ دوست براجمان تھے اور اس کے ساتھ ہی دفتر میں چھٹی کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہو گیا۔ رہ گئے میں اور میرے مہمان۔ میں نے چوکیدار سے چائے لانے کو کہا۔ چائے آئی تو اشفاق صاحب آ کے ایک ہاتھ میں بسکٹ کی پلیٹ اور دوسرے ہاتھ والی پلیٹ میں نمک پارے اور اکبرز میں میں شدت حیرت سے وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''یار کیا کروں میں ماں بھی بہت اچھی ہوں۔'' وہ پلیٹیں دھر کے چلے گئے۔ میں مہمان کافی دیر تک کوئی بات نہ کر سکے۔

ان دنوں دفتر اڑھائی بجے بند ہو جاتا تھا، اڑھائی بجتے ہی لوگ باگ گھروں کی راہ لیتے۔ چوکیدار پاس آ جاتا اور میں دفتر کے پچھواڑے چوکیدار کے کمرے میں گھس کر سو رہتا، البتہ اشفاق صاحب اپنے کمرے کام کرتے رہتے، کام نمٹا کر مطالعے میں مستغرق ہو جاتے، مطالعے سے قدرے تھک جاتے تو ٹیپ ریکارڈر ہیڈ فون کانوں سے لگا کر آنکھیں موند لیتے اور کوئی لیکچر سننے لگتے۔ پھر بیل بجاتے، چوکیدار بھاگا بھاگا آتا۔ پوچھتا جاگ گیا ہے۔ پٹھان چوکیدار طوطی مرجان تیزی دکھاتا۔ ''صاحب اٹھاؤں؟'' ''نہیں، جب جاگ جائے انہوں نے کبھی مجھے جگایا نہیں۔ میں اپنی مرضی سے پانچ بجے کے قریب بیدار ہوتا تو مرجان بتاتا کہ صاحب بیدار تھے۔ میں ان کے کمرے میں جاتا۔ تب وہ چوکیدار سے چائے لانے کو کہتے اور کمرے میں پھیلی روشنی میں شفقت شامل ہو جاتا۔ وہ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ تب وہ میرے باس نہیں بزرگ ہوتے اور میں برخوردار، نیازمند، عزیز مگر اگلی صبح جب دفتر لگتا تو اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل ہوتے اور خاکسار محض ریسرچ آفیسر۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اشفاق صاحب دفتری معاملات میں کسی قسم کی رورعایت نہ کرتے۔ اوپر سے ہوئی اُدھر ایک پیلے رنگ کا کاغذ میز پر آ جاتا جس پر ''ڈائریکٹر جنرل کی طرف سے سلام پہنچے'' تو چھپا ہوتا، پر کے قلم سے لکھی ہوتیں اور خاصی ''حوصلہ افزا'' ہوتیں۔ سو دفتری اوقات میں دفتر میں مکمل طور پر خاموشی ہوتی میز پر اپنے کام میں مستغرق ہوتا۔ کبھی کوئی مہمان آ نکلتا تو ہال میں داخل ہوتے ہی گھبرا سا جاتا۔ پھر سرگوشی احوال پوچھتا اور بھاگ نکلنے ہی میں عافیت سمجھتا۔ تاہم ایک انتظام پسند ڈائریکٹر جنرل ہونے کے باوجود

یک خاندان بھی بنا رکھا تھا جس کی بزرگ ترین ہستی وہ خود تھے۔ انہوں نے یہ کیسے manage کر رکھا ے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

دفتر آتے تو سارے دفتر کا راؤنڈ لیتے، یہ موٹر سائیکلیں سیدھی قطار میں کیوں نہیں، میز ذرا آگے کھسک آواز کیوں دیتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی باتوں پر نظر رکھتے تھے حتیٰ کہ اگر ڈاک کلرک کسی لفافے پر ٹکٹ چسپاں ے ٹیڑھا کر بیٹھتا تو بھی پکڑا جاتا "اسے اتارو اور ٹھیک سے چسپاں کرو۔"

روز وہ علی الصبح دفتر آ گئے۔ سیدھے چوکیدار کے کمرے میں گئے جو چائے بنا رہا تھا۔ "ارے خان، یو ویڈیو نہیں؟" مرجان کھسیانا سا مسکرایا۔ وہ اگلے روز بھی علی الصبح دفتر آئے، ان کے ہاتھ میں ایک یک کمبل۔ چوکیدار انہیں دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ چیزیں تھما کر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

دفتر کے ملازمین تک محدود نہ تھا۔ میں ایک ایسی تنگ و تاریک گلی سے بھی واقف ہوں جس کے ایک ے کے مکان میں ایک نابینا بزرگ رہتے تھے جن کی اپنی اولاد نہ تھی، ضعیف بیوی ان کی خدمت کرتی تھی، سے محروم ہو گئیں۔ آمدنی کا واحد ذریعہ اشفاق صاحب تھے۔ وہ ہر مہینے انہیں اتنی رقم پہنچا دیتے کہ مکان کے و کھانے پینے اور ادویات وغیرہ کا بندوبست ہو جاتا۔ وہ خود بھی ان کی خبر گیری کے لیے کبھی کبھی اس تنگ و میں پہنچتے اور کافی دیر ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ چونکہ یہ بستی میری رہائش گاہ کے قریب تھی، اس لیے میں ان قف تھا۔ اور بھی کئی تاریک گوشے ہوں گے جہاں ان کی مروت کا چراغ روشنی پھیلاتا تھا، مگر میں ان سے کبھی اپنے ایسے وظائف کا ذکر تک نہیں کرتے تھے۔

م کی محفل میں، میں اکثر خاموش رہتا، مگر ان کے مہربان رویے کی بنا پر آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ ایک شام یونہی دیا کہ "یہ جو آپ کا جملہ ہے کہ پاکستان کو کسی ان پڑھ نے نقصان نہیں پہنچایا اور جس کا یار لوگ یہ مطلب تے ہیں کہ آپ تعلیم کے خلاف ہیں تو......" میں ذرا سا جھجکا۔ انہوں نے چائے کی بھرپور چسکی لی تو میں نے ی۔ "تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے یہاں کے نظام تعلیم پر طنز ہے کہ وہ کیا مال پروڈیوس کر رہا ہے نہ کہ علم کی ان کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔ فرمانے لگے "لو ساہیوال کا پینڈو بات کو سمجھ گیا ہے اور ہمارے یں ہی برساتے چلے جاتے ہیں۔" ایک بار میں نے شہاب صاحب کی مخالفت میں شائع ہونے والی کسی کتاب اشفاق صاحب خود مان گئے ہیں شہاب نامے کے کچھ اوراق انہوں نے سپرد قلم کیے، کچھ ممتاز مفتی نے اور ے ادیبوں نے۔" "حیرت ہے۔" وہ کہنے لگے "یار اچھے بھلے پروفیسر لوگ بھی طنز کو نہیں سمجھتے۔"

تاہم ایسے موقعوں پر ایک آدھ جملے ہی پر اکتفا کرتے تھے، بات بڑھاتے نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی کسی ہم عصر ے بارے میں کسی مخالفانہ تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ کبھی کوئی ایسا ذکر چھیڑا بھی تو انہوں نے ٹوک دیا۔ البتہ اپنے بابا فضل باتیں خوب لطف لے لے کر بیان کرتے۔ فیصل آباد میں مقیم ایک بابا جی کا ذکر بھی کیا کرتے کہ میں ان دنوں پہنتا اور اکثر ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے حجرے میں میرے لیے ایک تہبند اور کرتہ رکھا ہوا تھا، ے تبدیل کر کے ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ ایک دن میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ ایک زمیندار قسم کا شخص داخل ہوا۔ لمبا کرتہ

شرل شرل کرتا تہہ بند اور سر پر بڑا سا پگڑ، مونچھیں تلوار مار کہ۔ آتے ہی بابا جی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور بڑی خوشی سے گویا ہوا۔ ''حضرت جی بس توبہ کر لی۔ قصہ ختم۔'' بابا جی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''کیا رہا؟'' اس شخص نے بات کاٹ دی۔ ''قبلہ آپ نے غور نہیں فرمایا۔ مکمل توبہ قبلہ مکمل۔'' بابا جی نے پھر توجہ نہ دی اور مخاطب ہونے لگے۔ وہ شخص پھر چہکا ''حضور واقعی، آپ کو غالباً یقین نہیں آتا، یقین مانیں۔ چھوڑ دیا۔ سب چھوڑ دیا۔''

بابا جی بے زاری سے بولے ''یہ بھی چھوڑ دو۔'' اور وہ شخص ایک لحظے کے لیے پریشان ہوا، پھر کچھ سوچ کے میں نے اپنی بات بڑھا دی۔ ''حضور کیمیا گری کیا ہے، کیا مٹی واقعی سونا بن جاتی ہے؟'' ''بن سکتی ہے، کیوں نہیں بن سکتی۔'' بابا جی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ایک منٹ۔'' وہ شخص اچھلا۔ لپک کر دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی اور کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔ ''باؤ جی کوئی کاغذ قلم نکالو، نسخہ لکھ لو۔ میں اور آپ بھائی وال۔ نہ آپ نسخہ کسی کو بتائیں میں۔ شاباش، شاباش کاغذ قلم.....'' پھر اونچی آواز میں..... ''جی بابا جی حضور وہ کیسے؟'' اس کا منہ بے کواڑ دروازے کی طرح کھلا تھا اور پلکیں جھپکنا تو جیسے اس کی فطرت میں ہی نہ تھا، سانپ کی طرح کہ اسی لیے تو وہ خزانے پہ بیٹھتا ہے۔ نے فرمایا ''ایسے کہ..... سونے کو مٹی سمجھا جائے۔'' اور اس کے ساتھ ہی زمیندار صاحب گویا پتھر کے ہو گئے۔

اشفاق صاحب اکثر بڑی پُر معنی باتیں کرتے مگر قدرت نے انہیں یہ ملکہ عطا کر رکھا تھا کہ وہ عام سی اپنے ساحرانہ انداز سے انتہائی پُر لطف اور فکر انگیز بنا دیتے مگر یہ ساحری دفتری اوقات میں نہ ہوتی۔ وہاں صرف پوائنٹ بات کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اردو سائنس بورڈ کی مطبوعات کی فروخت سے دفتر کے لیے بلڈنگ تعمیر کی جو بلاشبہ ایک مثال ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی وہ کافی ذہانت اور محنت سے کام لیتے ایسی کتب شائع کرتے جو فروخت کے ریکارڈ قائم کر سکیں اور ان کی آمدنی سے کوئی ایسی کتاب شائع کرتے جو اپنے اور مواد کے اعتبار سے نام آور ہو جیسے ''ریگستانی ٹڈی کا ہضمی نظام''۔

بظاہر لگتا تھا کہ انہیں کسی کا دست طلب دراز کرنا پسند نہیں۔ میں نے ایک بار دبا دبا سا احتجاج کیا اور عرض ہوا کہ آپ کا انداز سمجھ میں نہیں آتا، کبھی آپ بن مانگے چیز دیتے ہیں، کبھی مانگے پر نہیں دیتے اور کبھی مانگے پر دیتے ہیں، آدمی کیا کرے؟ انہوں نے مسکرا کر بات بدلی اور کافی دنوں کے بعد اس بات کی وضاحت کی جس کی طرف نے اشارہ کیا تھا۔ تب کھلا کہ ایک چیز کے دبانے اور دوسری سونپنے میں حکمت تھی۔ یار لوگ اس تقسیم پر ناخوش تھے کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ جو صحیح سمجھتے وہی کرتے۔ دوستوں کو بہر حال بہت بعد میں احساس ہوتا کہ فیصلے ہی میں بھلائی تھی۔

مجھے کبھی کبھی ان کے دولت کدے مگر نہیں دولت کدے نہیں، گھر میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا۔ گھر میں لیے کہا کہ وہاں جو گھر پنا دیکھا، وہ اپنے گھر میں کبھی محسوس نہ کیا۔ مہمان جو بھی ہوں، جتنے بھی ہوں ان کی یوں کی جاتی کہ وہ مہمان نہ رہتے، گھر والے ہی بن کے رہ جاتے۔ پھر ان کا دسترخوان بھی عجیب ہوتا، پرانے دیہات لیے ہوئے۔ کبھی چپڑی روٹی پہ چٹنی، کبھی باجرے کی روٹی دہی کے ساتھ، کبھی مکئی کی روٹی پر ساگ اور لسی۔ جدید

...ہوتے ہیں۔ یقیناً اس جمال میں بانو آپا کے مزاج اور سگھڑاپے کا کمال بھی شامل ہوتا۔ تاہم یہ نہیں ہوتا تھا کہ ...جس جاؤ کیونکہ وہ کام، کام اور کام کو بہرحال اہمیت دیتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو انہوں نے جس قدر تخلیقی کام ...مکمل نہ ہو پاتا۔ کئی الماریاں تو تلقین شاہ کے مسودات سے بھری پڑی تھیں۔ ناول، افسانے، ٹیلی ویژن کے ...اور تقریریں جدا۔ ان مسودات سے جو جگہ بچتی اور وہ بھی کافی تھی، اس میں فرش سے چھت تک الماریاں ہی ...یہ الماریاں نہایت اہم کتب سے بھری پڑی اور یہ کتب سجانے دکھانے کے لیے نہیں ہضم کرنے کے لیے تھیں ...پر قدرت حاصل تھی۔

جب وہ اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل کے منصب سے سبکدوش ہو گئے تو زیادہ وقت گھر پر گزارتے ...بھی ان کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ صبح آٹھ بجے گھر کے پچھواڑے قائم ریکارڈنگ سٹوڈیو میں جا بیٹھتے اور ...لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ان کے شہرۂ آفاق ریڈیائی فیچر ''تلقین شاہ'' کی ریکارڈنگ یہیں پر ہوتی۔ ...کی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ان کی بھی آرزو ہوتی کہ میں گاہے بگاہے آ جایا کروں، مگر اس کا انہوں نے ...یوں کیا کہ ''تلقین شاہ'' میں میرے لیے ایک کردار تخلیق کیا۔ ماسٹر خوشی محمد کا۔ ظاہر ہے کہ مجھے صداکاری ...تو تھا نہیں مگر وہ ریکارڈنگ کے دوران میرا کندھا تھپتھپاتے جاتے۔ سو آہستہ آہستہ میں رواں ہو گیا۔ ''تلقین ...پروگراموں میں مختلف لوگ حصہ لیتے، میں نے محسوس کیا کہ تلقین شاہ کے حوالے سے مختلف لوگوں کی پُروقار ...سے مدد کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ وہ اپنے صداکاروں کے نجی مسائل پہ گفتگو کرتے اور حتی الامکان ...کوشش کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں جو بچے کام کرتے تھے، وہ اشفاق صاحب کو ابو جی کہہ کر مخاطب ...اور گھر میں بھاگے پھرتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی گھر ہو۔

اشفاق صاحب اپنے غموں اور بیماریوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اکثر کسی ملازم ہی سے پتہ چلتا کہ ان کا آپریشن ...ہسپتال میں داخل رہے ہیں۔ آخری بار وہ آپریشن کے بعد گھر آئے تو چارپائی سے لگ کے رہ گئے۔ اس ...بھی مطالعہ ان کا معمول رہا۔ میں گاہے بگاہے ان کی عیادت کو جاتا رہا۔ بس چند منٹ کے لیے ہی بیٹھتا کہ انہیں ...تنہائی راس تھی۔ ایک شام مجھے شادی کی تقریب میں شرکت کا ایک کارڈ ملا۔ دولہا دلہن کے ناموں سے میں آشنا ...بارات داستان سرائے سے روانہ ہونا تھی۔ میں نے ان کے خادم خاص محمد رفیق جو یہ کارڈ لائے تھے، سے ...یہ سلسلہ ہے؟ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اچانک ایک خیال نے ذہن میں چھید کر دیا ...آخری ملاقات کا اہتمام تو نہیں!!

شادی کی شام میں ان کے یہاں پہنچا تو ہر طرف قمقمے روشن تھے، بارات تیار تھی۔ بڑی رونق تھی، دو آدمی ...صاحب کو سہارا دے کر باہر لائے۔ وہ دولہا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ مٹھائی اور کوک سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ میں ...چہرے کو ڈھونڈنے لگا مگر کوئی شاعر، ادیب یا صحافی بارات میں شریک نہ تھا۔ ان کے رشتہ داروں اور عزیزوں کا ...پھر بارات ایک شادی گھر کے لیے روانہ ہوئی۔ میں گیٹ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کوئی واقف ہے نہیں، کس گاڑی ...ساتھ ہی بانو آپا کی آواز آئی۔ ''اسلم تم میرے ساتھ چلو گے۔'' اور پھر گاڑی میں بانو آپا نے بتایا کہ دولہا کی

والدہ خاں صاحب کی نیاز مند ہے، انہیں مالی پریشانی نہیں ہے مگر عزیز کوئی نہیں۔ انہوں نے اس پریشانی کا اظہار
صاحب سے کیا تو انہوں نے یہ سارا اہتمام کرنے کا حکم دیا۔ بانو آپا یوں مصروف اور خوش تھیں جیسے ان کے اپنے
شادی ہو۔ تقریب کے اختتام پر پھر پریشانی کہ واپس کیسے جایا جائے۔ پلٹ کے دیکھا تو اشفاق صاحب وہ
سہارا لے کر میری طرف آ رہے تھے، ساتھ بانو آپا تھیں۔ بانو آپا نے گاڑی منگوائی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے
ملایا۔ آخری بار اور رخصت کر دیا..... ہمیشہ کے لیے۔

چند ہی دنوں کے بعد داستان سرائے کے آس پاس سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا اور اشفاق صاحب اپنے
میں سفید چادر اوڑھے ابدی نیند سو رہے تھے۔ پھر وہ اسی نیند میں ڈوبے، آنسوؤں سے لبریز آنکھوں والے لوگ
کندھوں پر تیرتے ہوئے آخری آرامگاہ میں چلے گئے۔ ہزاروں لوگ تھے اور ہر طبقے کے لوگ۔ دانشور، شاعر
صوفی، فقیر، مسکین، صداکار، گلوکار اور عام آدمی، ریڑھی والے، تانگے والے، رکشے والے۔ ان میں سے کچھ اشفاق
خاں کو، کچھ اشفاق صاحب کو، کچھ ڈائریکٹر جنرل کو، کچھ ایک بڑے صوفی کو، کچھ ایک بڑے مفکر کو، کچھ تلقین شاہ کو رخصت
کرنے آئے تھے۔ ایک شخص کے ساتھ بہت سی شخصیات رخصت ہو گئیں۔

مجھے بطور ڈائریکٹر جنرل اشفاق صاحب کے بارے میں تاثرات بیان کرنا تھے مگر میں ادھر ادھر بھٹک
آپ کے سامنے ہے۔ ان کی افسری کے سٹائل سے انصاف ہو سکا اور نہ ہی کسی اور پہلو پر ٹھیک سے بات ہو سکی۔
یہی ہے اور یقیناً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ فی الوقت میں کچھ لکھنے کا ارادہ ترک ہی کر دوں اور اس وقت
کروں جب میں کچھ لکھنے کے قابل ہوں۔ وہ بھی اگر ہو سکا تو......

"بابا وہ ہوتا ہے جو لینے کے نہیں دینے کے مقام پر ہو۔ یہ اس کی موٹی سی نشانی ہے۔ جب بھی آپ کسی
ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر سمجھیں کہ یہ بابا ہے، اور یہ داتا ہے، عطا کرنے والا آدمی ہے۔"

(اشفاق احمد، زاویہ)

ریاض محمود کے نام

21-12-1990

عزیزم مسلمت!

اس سے پہلے تم کو ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ یہ خط اس کے جواب کی یاد دہانی نہیں ہے۔ یہ
ہی لکھ رہا ہوں۔ محض اس قلم کو test کرنے کے لیے اور اس پرانے air bath کو دیکھنے کے لیے کہ اس میں کتنی جان
اور کہاں تک پہنچتا ہے اور اگر پہنچ جاتا ہے تو پھٹتا تو نہیں۔ تم اس کا جواب لکھنے کی کوشش نہ کرنا اور مزے سے پتے وغیرہ
افسوس کہ اس قلم کی سیاہی دوسری جانب نکل رہی ہے۔ اس لیے اب ایک اور استعمال کرتا ہوں۔ کل ...
آئے تھے، پوچھنے لگے کہ چند مہینوں سے ریاض نظر نہیں آتا۔ میں نے منہ پکا کر کے کہا کہ اس کے ساتھ کچھ ناراضگی
ہے۔ میں نے چند الفاظ فضی اور کاکے کے خلاف کہہ دیے۔ اس نے تو برداشت کر لیے لیکن بانو آگے سے بولیں تم
نے کبھی آپ کے بچوں پر تنقید کی ہے جو آپ ہمارے بچوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ اس پر بات بڑھ گئی اور انہوں

جانا ترک کر دیا۔

ظفر اس وقت سے پریشان ہے اور منہ کھجا کر ہر ملاقات پر یہ کہتا ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا لیکن جب میں اسے تو وہ تمہاری بے وقوفی پر بہت ناراض ہوتا ہے کہ اس گدھے کو سوچنا چاہیے تھا کہ اتنے سالوں کی تو دشمنی بھی گنوا رہا ہے۔ مجھ سے انہوں نے تمہارے مکان کا پتہ پوچھا تو میں نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اب وغیرہ جا کر خود تمہارے گھر کا پتہ معلوم کر رہا ہے اور کافی پریشان ہے۔

بھی یہ سیاہی تو بہت تنگ کر رہی ہے۔ اس لیے ختم کرتا ہوں۔ ویسے تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔

دعا گو

اشفاق احمد

تہران (ایران)

2-6-1991

عزیزم سلامت باشید!

ہر گاہ کہ من ارادہ کردہ بودم کہ حضر فروش گاہ جناب عالی شدم بعد از خیال من مبدل گرد کہ من بجائے تربت اینجا زائرین حضرت امام خمینی روح اللہ شدم۔ خیلے خوش قسمت ہستم کہ دی شب زیارت روضہ حضرت امام خمینی شدم..... معافی چاہتا ہوں کہ ڈیڑھ دو دن کے مسلسل استعمال سے اب زبان اور قلم فارسی ہی کی طرف مائل اور انہی ہواؤں سے لطف لیتے ہیں۔ ابھی کوئی ہفتہ بھر ادھر ہی قیام ہوگا اور پھر انشاء اللہ جمعہ کے روز واپسی

جب ہم مشہد جائیں گے تو آپ کا علاقہ بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگا اور وہ جو کہتے ہیں کہ رات کے کی بتیاں سیالکوٹ سے نظر آتی ہیں، ایسا ہی حال تمہاری بتیوں کا ہوگا اور جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں گی میں بین شرط ایک ہی ہے کہ تربت میں روشنی کا انتظام ہو۔ بتیاں جلتی ہوں۔ لوڈ شیڈنگ کا معاملہ نہ ہو۔

اس وقت کا ایران میرے زمانے کے ایران سے بالکل مختلف ہے۔ واضح فرق بیبیوں میں نظر آیا ہے جو اب رومال باندھ کر ٹخنوں تک کا لمبا کوٹ پہن کر باہر نکلتی ہیں، خریداری کرتی ہیں، سکولوں کالجوں میں جاتی ہیں اور کام کرتی ہیں لیکن وہ اس لباس سے خوش نہیں ہیں کہ ایک تو ساری شو ماری گئی۔ دوسرے وہ تڑپ جو راہ چلتوں کام کرنے والوں کے دلوں میں خواہ مخواہ پیدا کر دیتی تھیں، وہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔

اور جو یہ نہ ہو تو پھر زندگی بیکار ہے۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں، رسالے اور گانے بجانے جو شاہ کے زمانے میں بازار کے ہر موڑ پر بکتے تھے اور جن کی مورتیں ہم بھی پاکستان سے آ کر بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے، ان کا نام و باقی نہیں۔ عمومی حالت یہ ہے کہ فی الحال لوگوں کو اور حکومت کو یہ معلوم نہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ انقلاب کے بعد امام خمینی سے 1/4 طاقت کی بھی ہوتی یا 1/10 بلکہ 1/100 طاقت کی بھی ہوتی تو کام آگے چل سکتا تھا مگر مجھے نظر نہیں آتا۔ اس سے معاملہ رکا ہوا ہے۔ پورا انجن سٹیم سے بھرا ہوا اور کوئلوں سے بھنچا ہوا سٹیشن پر کھڑا ہے ار

ڈرائیور کا پتہ نہیں کہ کدھر گیا۔ ایک امید یہ بھی بندھی ہے کہ ابھی آ جائے گا۔ ایک خوف یہ بھی دامن گیر ہے کہ کدھر سے آئے گا۔

اچھا تم اس کالے پانی کی ابھی کتنی قید اور کاٹو گے۔ اگر تم کو مستقلاً اگست میں آنا ہو تو پھر درمیان میں کوئی چکر گے کہ نہیں۔ پچھلی مرتبہ کا تمہارا آنا بالکل بے کار گیا۔ ایک بھی مفصل ملاقات نہ ہو سکی۔ اکیلا میں ہی نہیں اس شکوے انکل ظفر بھی بڑی شدت سے شریک ہیں۔ تمہاری آپا کا پرانا فلسفہ ہے کہ جوں جوں بچے جوان ہوتے جاتے ہیں، چوہا بنتے جاتے ہیں۔

شیر خواری میں ان کی اتنی فکر نہیں ہوتی جس قدر ان کے جوان ہو جانے پر ہوتی ہے۔ میں ٹھیک ہوں لیکن ٹھیک نہیں ہوں کہ ایسے لمبے لمبے سفر کر سکوں اور اتنی بڑی بھیڑوں میں خود کو سہار سکوں۔ اب اندر سے ہی معاملہ ہونے لگا ہے اور یہ تجربہ بھی خوب ہے۔ اپنے سارے دوستوں کو میرا اسلام مسنون پہنچا دینا اور ان سے کہنا کہ گرمی بچیں۔ باہر کی گرمی سے بھی اور اندر کی گرمی سے بھی بلکہ اندر کی گرمی سے زیادہ بچیں۔ یہ انا کا ایک خوفناک روپ ہے کی راہ میں حائل ہوتا رہتا ہے۔

ان دنوں تمہارے تربت میں کون سا پھل چل رہا ہے؟

دعائیں اور مزید دعائیں۔

دعا گو

اشفاق احمد

داستان سرائے

121/C ماڈل ٹاؤن

لاہور

24-3-1991

عزیزی ریاض میاں! سلامت رہو، خوش رہو۔ کل 23 مارچ تھی مگر ہمارا یہ دن بھی روتے پیٹتے اور آنسو گزرا۔ اشتیاق کے بڑے بیٹے صائل کی موت کی خبر تم کو مل چکی ہوگی۔ ہمارے سارے خاندان میں اور پورے ایک کہرام مچا ہے۔ کسی ظالم نے صائل کو اس کے گھر کے گیٹ پر چودہ گولیاں مار کر ختم کر دیا۔ اس کی بیٹی (جسے وہ لایا تھا) یہ سارا منظر دیکھتی رہی۔ اب تک قاتل کا یا قاتلوں کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اشتیاق غم کی مورت بنا، کمروں میں خانہ میں گھومتا رہتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بس اس کو ہونی کہتے ہیں اور اس کے آگے کوئی تدبیر کوئی تجویز کارگر نہیں ہوتی۔

جس روز مجھے تمہارا خط ملا ہے اس سے دو دن بعد یہ سانحہ عمل میں آیا۔ ذہن ماؤف اور جسم شل ہے۔ بانو کو فون کیا تھا، وہ بھی تحیر اور غم میں ڈوبی بیٹھی ہے۔ فون پر ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکی۔ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے صحت اب اچھی ہے۔

نعیمی میاں واپس اپنی Post پر چلے گئے ہیں اور انہوں نے اسلام آباد میں اپنی کرسی سنبھال لی ہے اور فراز [illegible]یے غیر ہی چلا گیا ہے اور کسی اور منصب کی تلاش میں ہے۔ میرے آرڈر بھی آ گئے ہیں لیکن ان میں سقم ہے یعنی [illegible] سے ڈائریکٹر کر دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سب غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے اور پرائم منسٹر سیکریٹریٹ کو اصل حقیقت [illegible]۔ میں نے ابھی تک چارج نہیں لیا لیکن سیانے کہتے ہیں کہ چارج لے لو، اس کے بعد اپنے دعوے کا حکم

عجیب سی دنیا ہے اور عجیب سے حالات میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اب کوئی خاص مزا باقی نہیں رہا۔ تم یہاں [illegible] ڈھارس بندھتی لیکن اب یہی حکم ہے کہ تم دور رہو اور یہی حکم درست ہے۔

اپنے دوستوں کو میرا سلام دینا اور بتانا کہ اُن سب کے لیے میرے پاس ڈھیر ساری دعائیں ہیں۔

اللہ تم سب کو خوش رکھے اور آسانیاں عطا فرمائے۔

دعا گو

اشفاق احمد

2-9-1967

قدسیہ جان سلامت رہو۔

میں کل دوپہر کراچی پہنچ گیا اور خالو سرور کے جنازے میں شرکت کی۔ قبرستان گئے اور اپنے ہاتھ سے مٹی دی [illegible] گھر پہنچے۔ یہاں دو گھڑی ماسی جی سے باتیں کرنے کے بعد اجازت چاہی اور اپنے ہوٹل چلا آیا۔

لاہور ایئرپورٹ پر افتخار بھائی، اقبال بھائی، شیر آغا، ازمار خاں، باجی اور گڈی موجود تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ [illegible] میں آئے تھے اور یہ امر مجبوری سبھوں کے پاس فرسٹ کلاس کے ٹکٹ تھے۔ باجی میرے اس ڈیرے پر بہت [illegible]۔ کراچی والوں کو میری صورت دیکھ کر یقین نہ آیا۔ میں نے کہا ماموں کوئی ہمارے رشتہ دار نہیں تھے، میرے [illegible] تھے اس لیے چلا آیا۔ سب لوگ شکر گزار اور ممنون تھے۔

شام کو جب میں اپنا اٹیچی اور تھیلا اٹھا کر چلنے لگا تو روکا گیا۔ میں نے کہا جہاں لواحقین پر اتنا بوجھ ہو وہاں میں [illegible] نہیں کرتا، یہ میرا اصول ہے۔ ایک دو دوست کے پاس ٹھہروں گا۔ سب نے میرے اس اصول کو بہت سراہا [illegible] کے۔ کہنے لگی اپنے کسی کام سے آئے ہو گے آپ۔ وہ کرنے جا رہے ہیں۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ملاحظہ کیجیے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

آج مجھے اپنی میٹنگ کا تکلیف دہ کام ہے۔ سارا دن اس میں گزرے گا۔ کل اتوار کے روز صبح آٹھ بجے رسم قل [illegible] ہوں گا۔ تم سب کو بوسے! بچوں کو ساتھ پیار بھی۔

تمہارا

اشفاق

●●●⬤●●●

75-جی ماڈل ٹاؤن

اصل وجہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن بظاہر خاں صاحب اس بات سے پریشان تھے کہ ہم لوگ آپا جی کے گھر
فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وجہ جو بھی تھی اب گھر کی تلاش ہوئی۔ 36۔جی کی بغلی گلی میں مطلوبہ گھر مل گیا، لیکن یہ گھر
ضروریات کے لیے بہت بڑا تھا۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ آپا صابرہ گھر کی مین بلڈنگ میں آدھے گھر میں
جائیں۔ گھر کے پچھلے آنگن میں بائیں ہاتھ ایک تین کمروں کا گیسٹ ہاؤس تھا۔ اس میں ریاض محمود، بانو باجی نے
ڈال لیا۔ بائیں ہاتھ آنگن میں کھلنے والے دروازے سے ملحقہ دو کمرے تھے۔ ایک میں جیونی کا باورچی خانہ اور
کشادہ کمرہ گھریلو کاٹھ کباڑ اور گودام کی شکل اختیار کر گیا۔

اس طرح کے بنگلے ماڈل ٹاؤن میں عام ہیں۔ گھر کے دو پھاٹک تھے۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں ایک
سے داخلے کے لیے استعمال ہوتا اور دوسری جانب سے اخراج کی صورت نکلتی۔

آپا صابرہ کی سائیڈ پر بڑے میٹھے آموں کے پیڑ تھے اور ہماری طرف ایلچی کے دو تین درخت بڑے
سے لدے جاتے۔ برآمدے کے سامنے کشادہ پورچ تھی جس میں آسانی سے دو کاریں پارک کی جا سکتی تھیں۔

ہماری سائیڈ پر ایک ڈونگی گراؤنڈ تھی جسے اینٹوں سے پختہ بنا دیا گیا تھا۔ اسی ڈونگی گراؤنڈ کے عین مقابل
پہلا کمرہ ڈائننگ روم بنا لیا۔ اس کے اوپر دو لمبے سے چھوٹے کمرے تھے جن میں لاکر خاں صاحب کی کتابیں
طرح بے سروسامانی کے عالم میں ڈھیر کر دی گئیں جیسے وہ 36۔جی میں گیلری کے اوپر ڈھیر تھیں۔

برآمدے میں سے اندر ایک بڑا کمرہ ڈرائنگ روم بنا لیا گیا، جس کا مصرف کم کم تھا۔ باہر کی سڑک کی طرف
والا کمرہ مہمان خانہ ٹھہرا، جس کا استعمال اور بھی کم تھا۔ پھر ہمارا سونے کا کمرہ تھا۔ یہ کافی کشادہ اور ہوادار تھا۔ اس کے
ہی پھر برآمدہ شروع ہو جاتا اور برآمدے اور خوابگاہ کے درمیان ایک کافی بڑا کمرہ تھا جو خاں صاحب کی سٹڈی ہو
تنہائی طلب لمحات میں گچھا تھی۔ جب کبھی اس کمرے میں داخل ہوتے، غسلخانے سے ہو کر جانا پڑتا۔

پچھلا برآمدہ کم و بیش استعمال میں آتا لیکن پچھلے آنگن میں خوب ریل پیل رہتی۔ یہاں ایک پرانا

ت تو جس پر دو رسیاں مضبوطی سے باندھ کر ان میں آدھے ٹائر جتنے لوہے کے Rings باندھے گئے اور خاں

بھی سے ٹانگیں اُٹھا کر کبھی دائیں کبھی بائیں ورزش کرنے لگے۔ ان کی ورزش کے اوقات میں بڑی

تو ۔ بچے ابھی چھوٹے تھے ورنہ وہ نقل میں زور آزمائی کرتے۔

لوگ بہت کم آپا صابرہ کی طرف جاتے۔ وہ عام طور پر اپنا کھانا بڑے سلیقے سے ٹرے میں سجا کر ہماری طرف

ایک ہی میز پر اپنا اپنا کھانا کھاتے۔ اسی طرح روحی بیگم بھی کانٹے، چمچ اور سرویٹ سے لیس اپنا ٹرے لاتی

بیٹھ کر کھاتی۔ نہ کبھی انہیں share کرنے کا خیال آیا نہ کبھی ہم نے انہیں کچھ پاس کرنے کی جسارت ہی

ہی دال چپاتی سبزی بھات کھانے والے تھے، انہیں کچھ آفر کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

آپا صابرہ اپنی چائے کی پیالی لے کر باہر والے برآمدے میں بیٹھتیں لیکن ہماری طرف سے کبھی اُدھر کوئی نہ

روحی کی والدہ بی بی جی اپنے اندر ہی رہتیں۔ اُن کا ہمارے چیزن سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس گھر سے دو تین اہم واقعات وابستہ ہیں۔

فیض صاحب کا آنا جانا

فوکسی کار کا خریدا جانا

"دھوپ سائے" فلم کی شوٹنگ

فیض صاحب ایچ بلاک کے موڑ پر رہتے تھے۔ سلیمہ اور میزو روحی کی ہم عمر تھیں، لیکن یہ ایک دوسرے کی

جانے کیوں نہ بن سکیں۔

جب ہم 75۔جی میں آئے تو سب سے پہلی واقفیت فیض صاحب سے ہوئی۔ ان کا گھر ایچ بلاک میں ایک موڑ

پر تھا۔ یہاں وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سلیمہ تو شاید ہماری طرف کبھی نہیں آئی لیکن میزو بڑی

کے ساتھ کبھی کبھی اکیلی ہی ہمارے گھر آجاتی رہی۔

پہلی بار مجھے کپڑا بیچنے والی افغان عورتوں سے پالا بھی پڑا۔ اُن دنوں پھاٹک کھلے رہتے تھے۔ بلا روک ٹوک سر

پر کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے وہ دندناتی اندر آتیں۔ ان کا محاورہ تھا کہ وہ ہماری پکی ڈونگی گراؤنڈ کے کنارے

رکھ دیتیں۔ یہ اب خواتین کی اکثریت کا گھر تھا۔ آپا صابرہ، روحی اس کی آواز سن کر بھاگی آتیں۔ بانو باجی کو

بھی جاتی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر آنگن والی سائیڈ سے برآمد ہو جاتی۔ میزو کو بھی عموماً خبر دی جاتی۔ وہ بھی بھاگم بھاگ

اب رنگوں پر تبصرہ، میٹریل کی جانچ پڑتال، قیمت پر جھگڑا جاری ہو جاتا۔ اول تو نہ جانے انہوں نے کہاں پیسے

رکھے ہوتے۔ بے دریغ خرچ کر لیا جاتا۔ کبھی کبھی میزو کے پیسے کم پڑ جاتے تو وہ خاں صاحب کی لاڈلی اُن سے

لے لیتی۔

مردوں کا اس خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

فیض صاحب ان سے علیحدہ مجھے اور خاں صاحب سے ملنے آتے۔ وہ کبھی گھر کے اندر داخل نہ ہوتے۔ انہیں

ہمارے کھانے کے کمرے میں بھی کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ ڈونگی گراؤنڈ کی کسی کرسی پر آرام سے بیٹھ جاتے والوں کی فراغت کا انتظار کرتے۔

خاں صاحب عام طور پر اُردو بورڈ میں ہوتے یا ریڈیو سٹیشن۔ فیض صاحب بڑے صبر سے میرا انتظ جب میں اُن تک پہنچتی وہ چپ چاپ چیری کے درختوں کو اُن پر چہچہانے والے پرندوں سے ملاقات کرتے میں جواز لی سنگیت موجود ہوتا ہے، اُس کے ساز اُن کے اندر بجتے۔ اُن کے چہرے پر کوئی بوریت نہ ہوتی۔

جب کبھی خاں صاحب موجود ہوتے، وہ بڑی عقیدت سے پاس بیٹھتے۔ شاید اُن کی ملاقاتوں صاحب نے اندازہ لگایا کہ فیض صاحب ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے اُنہوں نے فیض صاحب صوفی'' کے نکتہ نظر سے مضمون قلمبند فرمایا۔

ایک روز فیض صاحب میرے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے مجھے بتایا ''بھئی! ہم ایک وفد مغربی پاک مشرقی پاکستان لے کر جا رہے ہیں۔ لاہور سے جمیلہ ہاشمی، اسلام آباد سے خاطر غزنوی ہمارے ساتھ ہوں گے کے ہم سفر ابھی نامزد نہیں ہوئے۔''

میں نے سوچا کہ بڑے بڑے ادیب جا رہے ہیں۔ کچھ ادبی محفلیں ہوں گی۔ معرکے کی تقریریں ہوں میں 1200 میل کے فاصلے کے باوجود یک جہتی کا اعادہ کیا جائے گا۔

''اور وہاں جا کر کیا پروگرام ہے فیض صاحب؟''

''کچھ نہیں بس سندربن دیکھیں گے۔ پہاڑوں پر جا کر کچھ لطف اُٹھائیں گے۔ موٹر بوٹ کی سیر کریں

میں خاموش رہ گئی۔ میرا خیال تھا سلیکشن میرٹ پر ہوئی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی ''آتشِ رفتہ'' نے چونکہ تھی۔ اس لیے ان کا حق فائق تھا لیکن ہمیشہ کی طرح دل میں حسد، لالچ اور کمینے نے حملہ کر دیا۔ جب فیض صاحب آئے اور کچھ عرصہ ملتے رہے تو میں نے اسی حسد کے تحت کہا ''فیض صاحب! اگر آپ جمیلہ کو میرٹ پر لے جاتے کوئی افسوس نہ ہوتا لیکن آپ نے حق ہمسائیگی بھی ادا نہ کیا۔''

یہ بات کہیں فیض صاحب نے پلے باندھ لی اور جب دوبارہ سونار دیس جانے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے بھی لے گئے۔ اس ٹرپ کا مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ فیض صاحب کے پاس ایک ہی ہوائی جہاز ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے ہوا۔ سفر میں عموماً انسان اپنے ہم سفروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے جو اس کی بنیادی خصلت ہوتی ہے۔ وہ بار بار کھل شخصیت سے جھانکنے لگتی ہے۔

فیض صاحب کو کسی بات کی جلدی نہ تھی۔ وہ اپنی ضرورت کو اُجاگر کرنے کے عادی نہ تھے۔ غسل خ گندے تولیے پڑے مل گئے، اُن ہی سے نہا لیتے۔ میز پر پسند کی ڈش دوسروں نے کھالی اور اُن کو ہاتھ روکنا پڑا تو خوش کچھ اور کھا کر اُٹھ گئے۔ کپڑے لانڈری میں بھیجے۔ واپس آنے میں تاخیر ہوئی۔ پرانے کپڑے ہی اٹھا کر چ جوتوں کو پالش کرنے پر اصرار نہیں۔ فرنٹ سیٹ پر معتبر بن کر بیٹھنے کی خواہش ندارد۔

فیض صاحب کی جھکی جھکی آنکھیں، نرم لہجے، ترنم بھری آواز سب مجھ پر اثر انداز ہوئی۔ ان جیسا بننے پر

ہے۔ میں جانتی تھی ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق سیکھتا ہے اور بسا اوقات بڑے لوگوں کی شناسائی اسے
ہے لیکن وہ اس شخصیت سے کچھ بھی سیکھ نہیں سکتا۔

عرصہ بعد فیض صاحب 75۔ جی نہ آتے۔ بس اردو بورڈ چلے جاتے۔ کبھی خاں صاحب نے ان ملاقاتوں
کیا۔ بس اتنا بتاتے۔ ''فیض صاحب آج آئے تھے۔''

نے کبھی ان ملاقاتوں کی تفصیل نہ پوچھی۔

ہم 121۔ سی میں منتقل ہو گئے تو فیض صاحب نے ہمیں بھلایا نہیں۔ وہ کبھی کبھی بلا تکلف چلے آتے۔
بغیر دکھلاوے اور Show off کیے ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ میری ان سے ملاقات کم کم ہوتی۔

میری کتاب ''امر بیل'' چھپی تو اس کا فنکشن در پیش تھا۔ ہمارا معیارِ زندگی بڑھ چکا تھا۔ ایک روز ہم فیض
کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو میں نے بڑی جرأت رندانہ سے کہا ''فیض صاحب! میری کتاب کا فنکشن ہو
پ اس کی صدارت کر دیں گے؟''

کر دیں گے۔'' انہوں نے سادگی سے کہا ''کارڈ بھجوا دینا۔''

پر خاں صاحب کہنے لگے ..... ''بھئی اتنے بڑے شاعر کو صدارت کے لیے کہتے ہوئے تمہیں خوف نہیں

ان کی بڑائی کا مجھ پر اس وقت کوئی تصور موجود نہ تھا۔

شن ہوا۔ اس میں باب جز نے مجھ پر مضمون پڑھا۔ خاں صاحب، احسان اکبر، سہیل عمر اور اصغر ندیم سید
مضمون پڑھے اور وہ خوبیاں بیان کیں جو نہ کتاب میں تھیں نہ صاحب کتاب میں۔

صاحب وقت سے کچھ پہلے پہنچے۔ بڑی توجہ سے مضمون سنتے رہے۔ فنکشن کے اختتام پر اُٹھے۔ روسٹرم پر
تقریر کی۔ افسوس اُن کی تقریر زبانی تھی اور تب ابھی ٹیپ ریکارڈ کا رواج نہ تھا، اس لیے وہ سنہری الفاظ ضائع

انوں سے ذرا دور اشیاء کی فراہمی انسان کے اندر جو فرحت پیدا کرتی ہے، اس کا گہرا تعلق ہر انسان کی ذاتی
ہے۔ کئی بار ہمیں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو نہ ہماری ضرورت ہوتی ہے نہ خواہش۔ ایسی صورت میں اشیاء کا
بال بن جاتا ہے۔

۔ جی میں تھوڑی دیر کے بعد خاں صاحب نے فوکسی کار خرید لی۔ 7262 نمبر کی یہ فوکسی گویا ہم سب کے
اضافہ تھی۔ بچے تو کار پر لٹو تھے لیکن باپ کی طرح وہ جذبات کو ابھی سے چھپا جانے والے تھے۔ سکول
تے جاتے چوری چوری اس کے پاس رُکتے، نظر بھر دیکھتے جیسے کوئی نوجوان محبوبہ کو غٹ غٹ پی جانے کے
کرتا ہے۔

فوکسی نے ہماری زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ دن کے وقت تو خاں صاحب کام پر اور بچے
تے لیکن شام کو اس پر عموماً باہر جانے کا اتفاق ہوتا۔ کبھی کبھی وہ چوری چوری آپس میں اس کی باتیں بھی